جدید غزل گو شاعر شجاع خاور

ڈاکٹر روحی سلطان

تلخیص: جدید شاعری میں جہاں موضوعی سطح پر تبدیلیاں آئیں وہیں ہیئت کے اعتبار سے بھی کئی طرح کے کامیاب تجربے ہوئے۔ جدید شاعری نے ترقی پسند تصورِ ادب کو فرسودہ قرار دیتے ہوئے ادب کو فرد کی ذات سے جوڑ کر نئی عصری حسیت کو پیش کیا۔ جدید شاعری میں محرومی ذات، خوف، تنہائی اور اجنبیت جیسے موضوعات کو نئے استعاراتی و علامتی لب و لہجے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ جدید شعرا میں جہاں کئی نام اہمیت کے حامل ہیں، وہیں شجاع خاور بھی اپنے منفرد لب و لہجے اور آہنگ کے شاعر ہیں۔ جنھوں نے جدید موضوعات کو اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے غیر معمولی انداز میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی۔

کلیدی الفاظ: جدید شاعری، جدید غزل، شجاع خاور، جدید عصری حسیت، نئی شعری آگہی۔

جدید غزل ایک انوکھی اصطلاح ہے۔ چوں کہ اس کا استعمال شاعری میں ہر نئے رجحان کے تحت ہوا بالخصوص اردو غزل اور اردو نظم میں۔ قلی قطب شاہ سے ولی دکنی جدید ہے، ولی سے میر تقی میر جدید ہے، میر سے مرزا اسداللہ خان غالب جدید ہے، غالب سے ڈاکٹر سر محمد اقبال جدید ہے اور اقبال سے فیض احمد فیض جدید ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو ہر شاعر اپنے زمانے میں پہلے سے جدید رہا ہے؛ لیکن اردو ادب میں صرف ایک خاص عہد کو ہی جدید عہد قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ۱۹۶۰ء کے بعد کے دور کو جدیدت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر جدیدیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اپنے دور کے مسائل اور

عصری حسیت کو پیش کرنے کا نام جدیدیت ہے۔لیکن شاعری میں اس اصطلاح کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ پرانے شعری رویوں کو نیا لباس پہنا کراور خوب سجا کر نئے روپ اور نئے رخ سے پیش کرنا جدیدیت کہلائے گا۔ جو قاری کو بلا واسطہ اور بالواسطہ طور سے متاثر بھی کرے۔

دیکھا جائے تو جدیدیت کو ان معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے کہ جدید استعاروں، کنایوں اور تشبیہات کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنا۔جدید شعرا کے یہاں فرسودہ شاعری سے بغاوت کا میلان نظر آتا ہے۔جدید شاعر آگے بڑھنے کا عزم رکھتا ہے،وسیع عزائم، بلند حوصلگی اور عصری شعور ان کے یہاں بلند پائے پر نظر آتا ہے۔جدید شاعر کے لیے آمد اور آورد کے امتیازات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ان کے یہاں یہ سب ایک ڈھکوسلا، فریب اور دھوکہ ہے۔اس طرح سے دیکھا جائے تو ان کے یہاں شاعری شعور کی پیداوار ہے۔شاعر معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے جو اپنے گردوپیش اور سائنسی اختراعات کے تغیرات کو محسوس کرتا ہے،اور ان ہی تغیرات کو شعری پیکر میں ڈال کر اپنے جذبات اور احساسات کو شعر کی صورت میں بہم پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ایسے ہی شعرا کی صف میں ایک نام شجاع خاور کا بھی آتا ہے۔

شجاع خاور دورِ حاضر کے ان فنکاروں میں سے ہیں جن کی شخصیت کے بہت روپ ہیں۔کچھ لوگ انہیں انگریزی زبان کے استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو شجاع خاور کو ان کے عہدے سے پہچانتے ہیں، تاہم ان کی بنیادی شخصیت ایک ایسے فنکار کی ہے جس نے تخلیقی کائنات کا سفر اپنی جوانی اور طالب علمی کے زمانہ سے ہی شروع کیا تھا۔

شجاع خاور اٹھارہ سال کی عمر سے شعر و شاعری کی طرف راغب ہوئے۔۱۹۶۸ء میں انھوں نے ''تاج محل'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جس میں تاج محل پر دیگر شعرا کی نظموں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ اپنی نظم بھی شامل ہے۔اس طرح ان کا شعری ذوق آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا۔۱۹۷۰ء میں دوسرا شعری مجموعہ ''دوسرا شجر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا جو بنیادی طور پر ۶۰۰ مصرعوں پر مشتمل ایک طویل نظم کی صورت میں ہے

۔اس کے بعد وہ غزل کی طرف متوجہ ہوئے اور۱۹۸۲ء میں ''واوین'' کے نام سے مجموعہ شائع ہوا جس میں انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کو شامل کیا تھا۔دیوی ناگری رسم الخط میں بھی ایک مجموعہ ۱۹۹۳ء میں ''بات'' کے نام سے شائع ہوا جو ۱۵۱ غزلوں پر مشتمل ہے۔اسی سال ''رشکِ فارسی'' کے عنوان سے خالص غزلوں پر مشتمل ان کا مجموعہ منظرِ عام پر آیا اور ۲۰۰۰ء میں ''اللہ ہُو'' کے نام سے ایک اور غزلوں کا مجموعہ شائع ہوا جو ادبی دنیا میں اُن کی شہرت کا سبب بنا۔ان کا کلام اپنے دور کے موقر رسائل و جرائد میں چھپتا رہا جسے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی۔شاعری کے جنون اور شوق کا یہ عالم تھا کہ ڈی۔آئی۔جی کے اعلیٰ عہدے کو قربان کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے اور تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارنا پسند کیا۔بقولِ پروفیسر محمد حسن:۔

''غزل میں سہلِ ممتنع کی شاعری کو اعلیٰ ترین سطح کی شاعری سمجھا جاتا رہا ہے اور سہلِ ممتنع کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اس کی نثر نہ ہو سکے اور شعر میں نثر کا سا دروبست قائم رہے، یہ خصوصیت شجاع خاور کے کلام میں موجود ہے۔''

شجاع خاور کے کلام میں بیک وقت کلاسکیت ،جدید لب ولہجہ اور انفرادیت ایک ساتھ جلوہ گر ہے اور یہی خصوصیات انھیں اپنے ہمعصر شعرا میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔چوں کہ جدیدیت سے منسلک شعرا ماضی کے دریچوں کو اکثر و بیشتر کھنگالتے ہوئے نظر آتے ہیں؛اس لیے انسان چاہے حال میں کتنی ہی خوشحال زندگی کیوں نہ بسر کر رہا ہو لیکن ماضی میں لگے زخموں سے بہ آسانی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ان زخموں کے وہ داغ آسانی سے مٹائے نہیں جا سکتے یہ زخم ان گھائل شدہ فنکاروں کے یہاں ہر دور میں تازہ ہی نظر آتے ہیں۔نمونے کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

تاریخ کی خاطر بھی دو ایک نشان چھوڑو
اندر ہی جلو لیکن باہر تو دھواں چھوڑ دو

یعنی ماضی میں جیسے لوگوں نے ظلم و ستم برداشت کیے۔جس بہادری کے ساتھ اُن لوگوں نے اپنے دور کے نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے تاریخ قائم کی ہے اسی طرح آج کی عوام کو بھی ان نامساعد حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیے بلکہ تمام زیادتیاں سہنی

چاہیے تاکہ یہی دور کل تاریخ کا ایک حصہ بن جائے گا جسے سارا زمانہ یاد کرے گا۔ جس قدر بھی آپ کو ایذائیں پہنچائی جائیں، اٹھاتے رہو، جس قدر بھی آپ کے دل میں آگ لگا دی جائے گی برداشت کرنے کی قوت پیدا کرو لیکن اس دستیاب شدہ وسائل سے اظہار کی صورت بھی نکالی ہوگی۔ نتیجے کے طور اظہار کی صورت میں آپ کے اندر کی آگ بھی کم ہوگی اور اس سے تاریخ بھی رقم ہوگی۔ یہ دھواں باہر چھوڑو تاکہ رہتی دنیا تک اس بات کا ثبوت رہے گا کہ آپ لوگوں نے کس قدر شجاعت اور بہادری سے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا۔

اس کے علاوہ جدید شعرا کے یہاں تشبیہہ، استعارہ اور علامت نگاری کی خصوصیت بھی بڑے پیمانے پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ تشبیہہ، استعارہ اور علامت نگاری دراصل خالص ادبی اصطلاحات ہیں لیکن درحقیقت یہ اصطلاحات اس نفسیاتی عمل کی نشاندہی کرتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر ایک فن پارہ اپنی منفرد شکل اختیار کرتا ہے تشبیہہ سیدھا سادہ موازنہ ہے۔ جب کہ استعارہ غیر واضح موازنہ ہے اور علامت اس عمل کی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر موازنہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا ہے۔ شاعر اس طرح کی اصطلاحات کا سہارا لیتا ہے یعنی اس کے اندر لغوی معنی کے علاوہ مزید معنی کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ شجاع خاور کے یہاں بھی ان ادبی اصطلاحات کا استعمال بڑے پیمانے پر ہوا ہے:۔

جسے سب سمجھتے تھے بے بال و پر
وہی اک پرندہ قفس لے اڑا

یہاں پرندہ اپنے اصلی معنی کے بجائے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

زمیں یونہی نہیں گھومتی کسی کے گرد
مجھے بھی دوستو دن رات چلنا پڑ گیا ہے

اس شعر میں بھی سورج بطور استعارہ بعید استعمال ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستانیوں کو انگریزوں سے آزادی ملی تو وہ تقسیم کی صورت میں ملی جہاں ایک ملک دو الگ الگ مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہو گیا، مذہب کی خونی سرحد کھینچ دی گئی اور فسادات کی زد میں پورا ملک آ گیا جس نے ہر طرف ماتم کی کیفیت پیدا کر دی۔ غم و

غصے کا عالم یہ رہا کہ انسانیت کا نام ونشان تک مٹ گیا انسان نیک و بد کی تمیز ہی بھول گیا، جس کی وجہ صبح آزادی کا سورج جو طلوح ہوا، اپنے ساتھ بہت سارا خون خرابہ، ہجرت و فسادات اور مذہبی منافرت جیسے مسائل لے کر آیا۔ ایک قوم دوسری قوم کے خون کے پیاسے ہو گئے ۔لوگ اپنی جائیدا تو کیا اپنے عزیز و اقربا تک کو چھوڑ کے دوسرے ملک میں پناہ لی اور جن لوگوں نے اسی سرزمین میں رہنے کی خواہش ظاہر کی انھیں تقسیم کے بعد بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں ہر معاملے میں قوم پرستی کا ثبوت دینا پڑا۔ اس کے باوجود اُن پر کئی طرح کے الزامات لگائے گئے ۔اردو ادب میں چوں کہ جدیدیت کا رجحان تقسیم ملک کے بعد ہی شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے گہرے زخم اور دیگر پیدا شدہ مسائل ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

مٹی کی سنی خون کے رشتوں کو نہ دیکھا
اور اس پہ بھی کہلاتے ہیں غدار میاں جی
کچھ ہم وطنوں کی بھی نظر صاف نہیں ہے
کچھ تم بھی گراتے نہیں دیوار میاں جی
تنقید کی عظمت کو بھلا کیسے سمجھتے
تم پڑھتے رہے میرؔ کے اشعار میاں جی

اس کے علاوہ جدیدیت سے وابستہ شعرا کے یہاں اجنبیت اور تنہائی جیسے موضوعات بڑے پیانے پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس لیے ان موضوعات کو بھی انھوں نے معنی کی نئی جہات کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ محبوب سے بچھڑنے کی تنہائی نہیں ہے یا شب فرقت کی تنہائی نہیں ہے بلکہ جدید شعرا کے یہاں یہ اجنبیت اور تنہائی کا احساس اس وقت پیدا ہوا جب وہ اپنے معاشرے اور زمانے کی تمام تر اذیتوں کو شدت سے محسوس کرتے ہیں ۔جن سے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنہائی کو فوقیت دیتے ہیں اور اسی تنہائی سے اُنھیں راحت ملتی ہے۔ وہ تنہائی کو ہی جز و زیست سمجھتے ہیں۔ شجاع خاور کے یہاں تنہائی کا یہ تصور اس طرح دیکھنے کو ملتا ہے:

ہر ایک شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے

ہوئی ہے ذہن پہ جب سے سوار تنہائی
تمام شہر میں اپنے ہمیں نظر آئے
پڑی ہے گھر میں ہمارے غریب تنہائی
پھر آج شام کو گھر لوٹ کر ہم آئیں گے
ملے گی پھروہی خانہ خراب تنہائی

شجاع خاور کے بہت سے اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔انھوں نے محض عوامی معیار اور اعتبار حاصل کرنے کے لیے اشعار نہیں کہے بلکہ ان کے کلام میں غور وفکر اور بعض جگہ آسان لفظوں میں فلسفیانہ گفتگو بھی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ان کی شاعری میں عصری دور کے اکثر و بیشتر مسائل کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کے کلام میں دہلی کی ٹکسالی زبان سے کلام کی بھی خوبصورتی دوبالا ہوجاتی ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آزادی کے بعد جن شعرانے دبستانِ دہلی کی جانب سے نمائندگی کی ان میں شجاع خاور کا نام خاص طور سے اہمیت کا حامل ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک طرف جہاں فنی کمالات پر نظر رکھی وہیں بے تکلف شعر کہنے کی روایت کو بھی برقرار رکھا۔

قیس اور فرہاد کے ہوتے ہوئے
خورد ہوں اجداد کے ہوتے ہوئے
سب کو بے اولادیت کا رنج ہے
اس قدر اولاد کے ہوتے ہوئے
مانگتے ہیں درس ہم مکتب مگر
کیا کروں استاد کے ہوتے ہوئے
بات کچھ تو ہے کہ میں آزاد ہوں
ہر طرف صیاد کے ہوتے ہوئے

شجاع ایک ایسے شاعر تھے جس کا اپنا ایک مخصوص لب ولہجہ تھا۔تصنع سے الگ جیتی جاگتی اور ہنستی مسکراتی زندگی کو وہ ہر بار متنوع موضوع کے اسرار و اموز سے گزارتے ہوئے نئے شعری رویوں کو فروغ دیتے تھے۔شستہ زبان اور رنگینی بیان کے طلسم سے وہ اپنے

شعری آہنگ میں ایسی توانائی پیدا کرتے ہیں جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔اس کے علاوہ یہ درد وغم اور یاس کے قائل نہیں ہیں ان کو ایک خوبصورت زندگی نصیب ہوئی تھی۔اگر چہ ان کی شاعری پر میؔر کا اثر نظر آتا ہے،لیکن اظہارِ بیان کی سطح پر ان کے یہاں سوؔدا کی گھن گرج اور جوش کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔انھوں نے مروجہ روایات سے انحراف کر کے نئے رنگوں کا استقبال کیا ہے۔بقولِ قرۃ العین:۔

''شجاع خاور کا کمال یہ ہے ان کے کتنے ہی اشعار حوالے کے طور پر نقل کیے جا سکتے ہیں۔ان کے اشعار کبھی بھی سپاٹ اور بے جان نہیں ہوتے،ان میں فکر،برجستگی اور ذات بیانی کے عناصر بیک وقت ملتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔''

بہر صورت شجاع خاور کی شاعری فنی اور موضوعی حیثیت سے جدید شعراء میں اپنا انفراد رکھتی ہے،جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُن کے یہاں بھی اگر چہ جدید شاعری ہی کے موضوعات اور اسالیب ہیں لیکن اس کے باوجود بھی اُنھوں نے نئے زاویوں اور نئے پہلوؤں کے استخراج سے ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔دیکھا جائے تو کوئی بھی شاعر موضوعی انحراف اور موضوعی انتخاب جیسی سطحوں پر ہی اپنی ایک منفرد شناخت قائم کر سکتا ہے۔شجاع خاور کے یہاں بھی موضوعی انحراف کے حامل پہلو ملتے ہیں۔مثال کے طور پر وہ تنہائی،خوف اور دہشت سے مغلوب نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ اس نوعیت کی کیفیات میں بھی زندگی جینے کی اُمیدیں وابستہ کرنے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شجاع کی شاعری عصری حسیت سے شناسائی کے ساتھ ساتھ نئی آگہی اور بصیرت عطا کرتی ہے۔

○○○